جاہلی معاشرہ کی فکری اساس
اور اُسوۂ عمرانی کے بنیادی تصرفات

Intellectual bases in the Ignorent socity (اَلْمُعَاشَرَة) and alterations made by sociological conduct of Prophet, (pbuh).

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی [1]

Abstract

Islam is known as a religion of peace, protection and prosperity. This religion was brought by Hazrat Muhammad (PBAUH) about 1400 years ago. The primary source and basic book of this religion is the holy Quraan. In the holly Quraan this religion was named by Allah as "Islam."(19/3) And it is due to its nature of peace and the protection of the human lives as well as their assets and their honors.

This is not a simple saying but based on some real facts. As we see that the word "ISLAM"is derived from "SALAMAT"and this word means in Arabic language: "being protected from all kinds of life threatening things."

The second most important word in Islam is "EEMAAN ." In the holy Quraan it is used for having absolute faith and intentional real practice on the religion of Islam. The word "EEMAAN"is derived from "AMAN." And it calls in English: "Peace and prosparity.

Even before Islam, in the age of arrogance, it is noted that there was a tradition in Arabs that whenever any of their enemies surrenders and hands over himself to them, they give him "AMAAN "(protection of all kinds). After giving "AMAAN ," they were legally and ethically bound and responsible to save him from all kinds of life threatening things. It calls in Arabic "AMAAN ."

In this situation the derivation of the word "EEMAAN"from "AMAN"(peace and prosperity) and "AMAAN" (protection of all kinds) is meaningful for the world of intellectuals. The name of this religion "ISLAM"and the faith on this religion "EEMAAN"both are indicating the peace, protection and prosperity for human being. Islam doesn't allow any kind of brutality and sabotage of human assets and lives. There are so many proves which indicate the nature of Islam as a religion of peace, protection and prosperity. In the sense of human society and civilization, the basic teaching of Islam is the human equality and rule of law.

In Arabian peninsula, in the age of arrogance, there was a very strong tribal system and was fully in force. Under this mindset they named their society as: (اَلْمُعْشَر) as well as (اَلْمُعَاشَرَہ). During this study its found that both of

[1] ایسوسی ایٹ پروفیسر، کلیہ معارفِ اسلامیہ، شعبہ اصول الدین، جامعہ کراچی

the terms are giving the sense of powersharing and having a power of resistance and force to make sure that their lives, hounors and assets are protected, saved and secured.

It means that they believed that every one who has a power, has a right to make the rules and ragulations of his own and put them in to force. It was an environment of law of jungle where only the power rules and it was full of ruthless.

Islam brought a good change and gave them the sense of the dignity and honor of the huminity. Under the "MITHAQ UL MADINA"(مِیثَاقُ المَدِینَہ) it was declared that there will be indiscriminate rule of law and justice for all the communities. And that the State shall manage the collective resistance against injustice , tyranny and mischief.

☆..............................☆..............................☆..............................☆..............................☆

معاشرہ کی وجہ تسمیہ

معاشرہ، عربی زبان کا لفظ ہے جو ''اَلْعَشْر'' سے بنا ہے۔ عربی میں ''اَلْعَشْر'' دس کو کہتے ہیں۔ یہ عربی اسمِ عدد ہے۔ جو گنتی اور شمار کے معنوں میں قدیم زمانوں سے

رائج چلا آرہا ہے۔ اِس کا استعمال ایک معاشرہ بمعنی ہیئتِ اجتماعی کی حد تک ہی اپنی حدود سے متجاوز ہوا ہے۔ ماسوا ذلک کہیں بھی یہ کلمہ اپنی اصل سے جدا ہو کر استعمال ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ دوسرے ہاتھ پہ لفظِ معاشرہ جب ہماری سماعتوں میں آتا ہے تو ہمارے ذہن میں سماج اور ہیئتِ اجتماعی کے نقوش ہی ابھرتے ہیں۔ دس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ جب یہ امر معلوم اور طے شدہ ہے کہ عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی میں لفظِ ''اَلْعَشْر'' کا لازمی اور حقیقی معنی ''دس'' ہی مروج رہا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دس کی انسانی سماج کے ساتھ آخر ایسی کیا نسبت ہے جس کی بناء پر عربی جیسی وسیع اور فصیح و بلیغ زبان میں اِس اہم معنی و مفہوم کی ادائیگی کے لیے ''اَلْعَشْر'' سے مشتق کلمہ مستعار لے لیا گیا ہے؟ انسانی ہیئتِ اجتماعی یا سماج کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں مختص کلمات خواہ ''عِشَارٌ'' ہو یا ''مُعَاشَرَۃٌ''، جہاد اور مجاہدہ کے وزن پر ہی آئے ہیں۔ یہ دونوں باب مفاعلہ کے مصادر ہیں۔ اِس باب کی اہم خاصیت ہے کہ اِس میں مقابلہ یا کسی مزاحمت کے خلاف مزاحمت کا معنی پایا جاتا ہے۔ بایں طور ان دونوں کا لغوی معنی ہے: ''ایک دوسرے کے سامنے دسیوں ہو جانا''۔ اِس طرح خود لفظِ معاشرہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عربوں کے نزدیک ایک دوسرے کے ہاتھوں معدوم ہو جانے کے خوف سے آزاد ہو کر میل جول کی زندگی کو وہ معاشرہ کہتے تھے۔ تاہم تائیدات و تصدیقات کے حوالے سے ہمیں محفوظ لغوی ذخائر پر انحصار کے سوا چارہ کار بھی نظر نہیں آتا اِس لیے ان سے رجوع ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

دس اور معاشرہ کا داخلی ارتباط

عرب حیات میں دیکھا جائے تو جس شعبے میں اِس نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے اور اپنے ذہن رسا کا عملی مظاہرہ کیا ہے وہ اُس کا لسانی سرمایہ اور اِس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ اِس پر عرب بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ اور قدرت نے بھی ان کی ان کاوشوں پر قرآن حکیم کی صورت میں انہیں بہت بڑے انعام سے نوازا ہے۔ مگر معتبر و متداول لغاتِ عرب کے مطالعہ سے بہت مرتبہ تسلی و تشفی نہیں ہوتی۔ جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ عرب لسانی ادب کو کما حقہ شائد محفوظ بنانے کے عمل میں کوتاہیاں موجود ہیں اور اس ضمن میں کرنے کے بہت سے کام ابھی باقی ہیں۔ نامی گرامی تمامی لغت نویس وجہ تسمیہ کے تعلق سے ذہنوں میں پائی جانے والی

الجھن کو دور کرنے میں بھی ناکام ہی نظر آتے ہیں۔ان کے بیانات وتصریحات سے اس ضمن میں بھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا کہ آخر لفظِ معاشرہ ہی کو انسانی ہیئتِ اجتماعی کا عنوان بننے کے لائق کیوں سمجھا گیا؟ یوں وجہ تسمیہ کے تعلق سے سوالات اپنی جگہ موجود ہی رہتے ہیں۔ بناء بریں اس کے بارے میں ازسرِنو نظر ڈالنے اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے تحقیق وتفتیش ضروری ہوجاتی ہے۔اس معاملے میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ لفظ ''اَلْعَشْر'' کے متعدد دیگر مشتقات بھی اہلِ زبان میں قدیم وقتوں سے ہی رائج ومستعمل رہے ہیں مگر یہ سب اپنے حقیقی ولازمی معنی کے ساتھ پوری طرح سے جڑے ہوئے ہیں۔مثلاً: ''اَلْعُشْر'' بمعنی: ''دسواں حصہ''، ''اَلْعِشَار''، از روئے لغاتِ متداولہ: ''دس ماہ کی گابھن اونٹنی''، ''اَلْعَاشِر''، اس کو کہتے ہیں جو ''دسویں درجہ پر موجود ہو'' اور پھر اسی سے بنا ہے: ''اَلْمَعْشَر'' بھی جو اپنے لازمی وحقیقی معنی سے جدا ہوکر ایک نئی وضع پر معنی دے رہا ہے۔عام طور اِس کا معنی ''گروہ'' کیا جاتا ہے۔مگر درست ترجمہ ہے: ''عمرانی یا معاشرتی گروہ''۔لہٰذا لفظِ معاشرہ کے تصور کے پیچھے عربوں کا یہ ذہن کارفرما نظر آتا ہے کہ اُن کے نزدیک ''دس افراد کا اجتماع اس قوت وقدرت اور اہمیت ووقعت کی بنیادی اکائی کے ہم معنی تھا جو ایک باعزت اور محفوظ زندگی کی ضامن ہوسکتی ہے''۔سطورِ ذیل میں ہم معاشرہ کے تعلق سے ہی بطورِ مثال اپنے مطالعہ کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔معروف لغت نویس صاحبِ الصحاح لکھتے ہیں:

''اَعْشَرَ الْقَوْمُ: صَارُوْا عَشَرَةً۔وَالْمُعَاشَرَةُ: اَلْمُخَالَطَةُ، وَکَذٰلِکَ التَّعَاشُرُ۔وَالْاِسْمُ الْعِشْرَةُ..وَالْعَشِیْرُ: اَلْمُعَاشِرُ.. یَعْنِیْ: اَلزَّوْجُ، لِاَنَّہٗ یُعَاشِرُھَا وَتُعَاشِرُہٗ''۔(1)

ترجمہ: جب کہا جاتا ہے: ''اَعْشَرَ الْقَوْمُ'' تو مراد ہوتی ہے: لوگوں کی تعداد دس ہوگئی۔اور باب مفاعلہ سے ''اَلْمُعَاشَرَةُ'' لوگوں کے اختلاط اور مل جل کر رہنے کو کہتے ہیں۔اسی معنی میں باب تفاعل یعنی: ''التَّعَاشُر'' بھی رائج اور شائع ہے۔ان کلمات کا ماخذ ومادّہ ''الْعِشْرَةُ''، یعنی لوگوں کا آپس میں میل جول اور اختلاط، ہے۔اور ''الْعَشِیْرُ'' عربی میں: ''اَلْمُعَاشِرُ'' کو کہتے ہیں یعنی: ''خاوند'' اِس لیے کہ وہ اِس عورت کے ساتھ مل کر زندگی گزارتا ہے اور یہ عورت اسی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔

الصاحب، عباد بن اسماعیل متوفی 385 ہجری المحیط فی اللغہ میں لکھتے ہیں:

''وَالْعَشِیْرُ: اَلَّذِیْ یُعَاشِرُکَ، ...وَبِہٖ سُمِّیَ زَوْجُ الْمَرْاَةِ عَشِیْرًا۔وَالْمَعْشَرُ: اَلْجَمَاعَةُ اَمْرُھُمْ وَاحِدٌ''۔(2)

ترجمہ: اور ''الْعَشِیْر'' اس شخص کو کہتے ہیں جو تمہارے ساتھ رہتا ہے۔اور عورت کے شریک حیات کو بھی ''الْعَشِیْر'' کہا جاتا ہے۔اور ''اَلْمَعْشَرُ'' لوگوں کی اُس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی ایک ہی اصول پر مجتمع ہوئی ہو۔

ابن منظور افریقی متوفی 711 ہجری، لسان العرب میں لکھتے ہیں:

''وَالْعُشْرُ وَالْعَشِیْرُ: جُزْءٌ مِّنْ عَشَرَةٍ...وَھُوَ الْمِعْشَارُ۔وَفِی التَّنْزِیْلِ: وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَا اٰتَیْنَاھُمْ، اَیْ مَا بَلَغَ مُشْرِکُوْا اَھْلِ مَکَّةَ مِعْشَارَ مَا اُوْتِیَ مَنْ قَبْلَھُمْ مِنَ الْقُدْرَةِ وَالْقُوَّةِ۔وَالْعَشِیْرُ: اَلْجُزْءُ مِنْ اَجْزَاءِ الْعَشَرَةِ''(3)

ترجمہ: ''الْعُشْرُ'' اور ''الْعَشِیْرُ'' کا معنی ہے: دس میں سے ایک۔اور اسی کو ''الْمِعْشَار'' بھی کہتے ہیں۔قرآن حکیم میں ہے: ''مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَا اٰتَیْنَاھُمْ'' (سبا:45)، یعنی مشرکین مکہ اُس قدرت وقوت کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچ سکے ہیں جو ہم نے اِن سے پہلے آنے والی اقوام کو عطا کی تھی۔اسی طرح ''الْعَشِیْر'' بھی دس کے مجموعہ میں سے ایک فرد کو کہتے ہیں۔

قریب قریب یہی بات ابن سیدہ متوفی 458ہجری اپنی ''المحکم و المحیط الاعظم میں بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔''الْعَشِیْرُ'' کا معنی ان کے ہاں: ''قریبی اور دوست'' بنتا ہے۔اسی طرح''وَ مَعْشَرُ الرَّجلِ'' کا معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: آدمی کے اہل خانہ۔ یونہی یہ کلمہ بمعنی جماعت بھی لیتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ لوگ ایک ساتھ مل جل کر ہی رہتے ہوں یا معاملہ کچھ اَور ہی ہو۔(4)

خود قرآنِ مجید اسی لفظ''اَلْعَشْر'' سے مشتق کلمہ مندرجہ ذیل طریق پر استعمال کرتا ہے:

''وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''(النساء:19)

ترجمہ: ''تم لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ دستور کے مطابق رہو اور زندگی بسر کرو ''

اِس آیۂ مبارکہ میں قرآن مجید کی مراد ظاہر و باہر ہے جس پر کسی ابہام کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ بایں طور''عَاشِرُوْا'' کا کلمہ یہاں ''ساتھ رہ کر زندگی گزارنے'' کا معنی دیتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ نزول قرآنِ حکیم کی مبارک ساعتوں تک لفظ معاشرہ کو ہیئتِ اجتماعی کے معنوں میں آئے ہوئے زمانے بیت چکے تھے اور طبیعتوں میں راسخ ہو چکنے کے بعد یہ کلمہ عرب ذہن نے لغوی کی بجائے اصطلاحی معنوں میں لینا معمول بنالیا ہے۔

اَفرادی قوت کی بنیادی اکائی

عرب اِس بات پہ یقین رکھتے تھے کہ معاشرے میں طاقت ہی راج کرتی ہے۔اِس لیے اِس دباؤ کا سامنا کرنے کے لیے لازم ہے کہ اِس میں شمولیت اختیار کرنے والے ایک مناسب دفاعی و مزاحمتی استعداد لے کر ہی اِس میں شامل ہوں۔اب دو ہی صورتیں تھیں: یا تو وہ خود''دس کی حدتک'' افرادی قوت پیدا کرلے یا کسی افرادی قوت کے ساتھ مل کر جیے اور اپنی حیات و مفادات کی بقا اور تحفظ کو یقینی بنائے۔دباؤ کے جتھوں (پریشر گروپس) کے ذریعے عدمِ تحفظ سے بچاؤ اسلامی نہیں بلکہ غیر اسلامی طریقہ ہے۔اسلام سے پہلے کے دور میں جب جزیرہ نمائے عرب میں جنگل کا قانون رائج تھا تو اُن لوگوں کو امن و عافیت اور تحفظ و بچاؤ کی راہ اِسی میں نظر آتی تھی کہ اپنے ہم نسل اور اہل قبیلہ کے ساتھ مربوط رہیں۔اپنی طاقت کو یوں مجتمع کرتے ہوئے اپنی مخالف قوتوں کے سامنے دباؤ کی ایک دیوار کھڑی کریں اور اس طرح یہ اپنے ہم قبیلہ افراد کے بچاؤ اور تحفظ کو یقینی بنائیں اور جواباً وہ بھی ان کے حق میں یہی خدمت سر انجام دیں۔لغتِ عرب کے مستند و معتبر مآخذ و مراجع کا بغور مطالعہ کرلینے کے باوجود، اگر عربوں کے سماجی ماحول کے اندر سے ہی متذکرہ بالا معنی کے حق میں تائیدات میسر نہ آسکیں، یہ عقدہ بدستور کسی سعی گرہ کشا کا منتظر ہی رہ جاتا ہے۔اس لیے کہ لفظ''اَلْعَشْر'' جو بنیادی طور پر ایک اسمِ عدد ہے، اور نو اور گیارہ کے درمیانی عدد کے لیے بولا جاتا ہے، اپنی جگہ سے نکل کر انسانوں کی ہیئتِ اجتماعی کا معنی دینے کے لائق کب، کیسے اور کن بنیادوں پر ہوا؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کے معلوم کیا جائے کہ آخر''دس'' اور ''انسانی معاشرے'' کا داخلی ارتباط کیا ہے؟ عربوں کو کلمات کے انتخاب اور چناؤ کے معاملے میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔اور ہر کلمہ کے استعمال کے پیچھے کوئی حکمت

کارفرما ہوتی تھی۔لہٰذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی کلمہ اپنی بنیاد سے بھی مسلسل مربوط رہے اور اسے چھوڑے بغیر اس بنیاد سے ہٹ کر کسی دوسرے معنی میں بھی رائج اور شائع ہو جائے۔انہی بنیادوں پہ ایک عرصہ کے غور خوض کے بعد اس ضمن میں ایک اَور ٹھوس اشارہ بھی ملا ہے جو اس گرہ کشائی میں ہمارا معاون و مددگار بن سکتا ہے۔اس کے لئے سیرۃِ ابنِ ہشام کے صفحات سے اقتباسِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

"قال ابن اسحق و کان عبد المطلب بن ھاشم، فیما یزعمون و اللہ اعلم، قد نذر حین لقی من قریش ما لقی عند حفر زمزم لئن ولد له عشرة نفر ثم بلغوا معه حتی یمنعوہ لینحرن احدھم للہ عند الکعبة۔ فلما توافی بنوہ عشرة و عرف انھم سیمنعونه، جمعھم ثم اخبرھم بنذرہ" (5)

ترجمہ:۔"ابن اسحٰق کا بیان ہے عبدالمطلب کا معاملہ یہ ہوا ہے، جیسا کہ لوگوں میں عام خیال پایا جاتا ہے اور حقیقتِ حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے، آپ نے زم زم کے کنویں کی کھدائی کے موقع پر قریش کی جانب سے مطالبہ شراکت داری کے باعث جو حالات پیش آئے تھے، منّت مانی تھی کہ اگر میرے ہاں دس لڑکے پیدا ہوئے اور میرے سامنے بالغ و توانا ہو گئے یہاں تک کہ وہ میری ڈھال بن جائیں تو میں ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں خانہ کعبہ کی دہلیز پہ قربان کرونگا، پھر جب بیٹوں کی تعداد دس تک پوری ہوگئی اور آپ نے بر بنائے معرفت یہ مان لیا کہ یہ سب ملکر دشمنوں اور مخالفین کے آگے ان کی ڈھال بنیں گے تو ان کو جمع کیا اور اپنی نذر کی بابت ان کو آگاہ کیا۔"

یہ اقتباس کلمات کی اونچ نیچ اور نشست و برخاست سے قطع نظر عربوں کی ایک خاص ذہنی ساخت کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب صدیوں سے بند اور فراموش شدہ زم زم کے کنویں کو نئے سرے سے کھودنے کی خواب میں بشارت ملنے کے بعد اسے کھودتے ہیں تو قبیلہ ٔ قریش کے لوگ آڑے آجاتے ہیں اور حصہ داری اور شراکت کا دعویٰ لیکر آموجود ہوتے ہیں۔یہ پورا واقعہ سیرتِ ابن ہشام کے صفحات پر موجود ہے۔(6) دراصل عرب دنیا میں میٹھے پانی کا کنواں حیات بخشی کا ضامن اور سب سے بڑا اثاثہ خیال کیا جاتا تھا۔پھر زم زم کے کنویں کی تعظیمی نسبتیں اور خانہ کعبہ کے ساتھ اِس کا متصل ہونا یہ تمامی امور ایسے تھے کہ پورا قبیلہ ٔ قریش اس کی ملکیت کے شرف و اعزاز میں حصہ داری کا طلبگار بن گیا تھا۔دوسرے ہاتھ پہ قبیلہ ٔ قریش کی اِس متحدہ قوت کے آگے مزاحمتی بند باندھنے کے لیے حضرت عبدالمطلب کے پاس مزاحمتی قوت کا بنیادی نصاب بھی پورا نہیں تھا۔اگر غور کیا جائے تو یہ واقعہ اور اسکے مندرجات عربوں کے ایک خاص ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ یہ کہ حضرت عبدالمطلب گروہِ قریش کے مقابلے میں خود کو تنہا، عاجز، لاچار اور کمزور خیال کرتے ہیں۔اور آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر آپ کے علاوہ ان کے دس جوان بیٹے دائیں بائیں موجود ہوں اور تمامی حوادث و خطرات سے مقابلہ کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہوئے ڈھال بن جائیں تو اس مزاحمتی وجود کی بدولت ضعف و کمزوری اور کسی بھی ناروا دباؤ سے بامن و عافیت نکلا جا سکتا ہے۔

اغیار سے عدمِ تحفظ کا احساس

زیرِنظر تحقیق کے مطابق لفظِ ''اَلْعَشْر'' کا ''اَلْمَعْشَر'' اور ''اَلْمُعَاشَرَۃُ'' کے معنٰی میں رائج ہونے کے پس منظر میں درحقیقت یہی ذہنی عنصر اور عرب سوچ کارفرما ہے۔ اور ''عَاشَرَ ، یُعَاشِرُ، مُعَاشَرَۃً و عِشَارًا '' کا لغوی معنٰی تو یہ بنتا ہے: ''ایک دوسرے کے مقابلے پر دسیوں ہوجانا''۔ اور اصطلاحی معنی ہے: ''بقائے حیات و مفادات کی خاطر افرادی قوت پیدا کر کے حوادث و مشکلاتِ حیات کا سامنا کر سکنے کے لائق ہوجانا'' اس لحاظ سے معاشرہ انسانوں کے اس اجتماع کو کہیں گے جس میں شریک افراد کسی بھی ظالمانہ رویہ، ناروا دباؤ اور مشکلاتِ حیات کا سامنا کر سکنے کے قابل ہوجائیں۔ یہاں بات ملحوظِ خاطر رہے کہ عربوں کا قبائلی ذہن اور اس کے تحت معرضِ وجود میں آنے والا معاشرہ ہے۔ جبکہ اسلامی سوچ اس سے الگ اور بہت مختلف ہے۔

عربوں میں یہ تاثر عام تھا کہ افرادی قوت کے اس تعداد سے کم ہونے کی صورت میں بقائے حیات و مفادات کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کیا کرتے تھے۔ اور صرف عربوں پر ہی کیا موقوف، باقی دنیا بلکہ ہر شے اپنی اپنی جگہ عدمِ تحفظ کے خطرات کو محسوس کرتی اور اپنے بچاؤ کی راہیں تلاشتی ہی نظر آتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

زندگی محبوب ایسی دیدہ ٔ قدرت میں ہے ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

آج بھی ہم لوگ اگرچہ کسی عددِ خاص پر تو متفق نظر نہیں آتے البتہ زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول ہی اپنی بقاء کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب، ''دس'' سے نیچے یعنی ایک سے لیکر نو تک کے افراد کے لیے 'بِضْعٌ '' کا کلمہ استعمال کیا کرتے تھے۔ ہم اردو میں اس کا ترجمہ '' کچھ'' یا ''چند ایک'' کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر یہ بات خاص دلچسپی کی حامل ہے کہ اس کلمے سے آپ سے آپ متبادر ہے کہ ان چند کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے، لامحالہ نو سے اوپر ہوجائیں گے اور دس ہوجائیں گے تو وہ اپنی حیثیت اور قوت وقدرت کو منوانے کے قابل ہوجائیں گے۔ اسی بنیاد پر قرآن حکیم کے ایک اہم مقام کا بھی حقیقی فہم نصیب ہوتا ہے۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات میں یہ کلمہ: ''بِضْعٌ ''استعمال ہوا ہے:

''فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ'' (الروم: 4)

ترجمہ: بس چند ہی برسوں میں۔

اور مراد یہ ہے کہ ان چند برسوں کی کوئی خاص اہمیت و حیثیت نہیں ہے۔ انہیں خاطر میں ہی نہ لایا جائے۔ ان امور کے پیشِ نظر اس تحقیق کی رو سے لفظِ ''اَلْعَشْر''، بمعنی: ''دس'' کے ''معاشرہ'' کے معنی میں جانے اور رائج ہونے کے پیچھے عربوں کا یہی ذہن یا ان کے ذہن کا فکری عنصر کارفرما رہا ہے۔ بعد کے وقتوں میں یہ کلمہ 'بقائے حیات و مفادات کی خاطر مل جل کر اور ایک ساتھ رہنے' کے تمامی معانی اور میدانوں میں پوری آزادی سے استعمال ہونے لگا۔ افرادی قوت کی قلت کا عربوں کو طعنہ بھی دیا جاتا تھا اور عار تک دلائی جاتی تھی۔ سموائل بن عادیا اپنے قصیدے میں کہتا ہے:

''تُعَيِّرُ نَا اَنَّا قَلِيلٌ عَدِيدُنَا فَقُلْتُ لَهَا اَنَّ الْكِرَامَ قَلِيلٌ ''(7)

ترجمہ: یہ عورت ہمیں عار دلاتی ہے کہ ہماری تعداد بہت قلیل ہے، تو میں نے اِس سے کہا معزز ین تعداد میں کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

عرب معاشرہ دراصل پورے طور پر قبائلی نظامِ حیات کے زیرِ اثر تھا۔ان میں قبائلی عصبیت اور غیرت وحمیت رچی بسی ہوئی تھی۔ بلکہ اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ قبائلی جمعیتیں بھی دراصل بقائے حیات کے لیے ہی بنی تھیں اور اپنے اپنے مفادات کو درپیش خطرات سے بچاؤ کی ضرورت کے باعث ہی معرض وجود میں آئی تھیں۔عربوں کو اِس بات کا پورا احساس وادراک تھا کہ انسانی سماج میں موجود لوگوں کے ذہن مختلف اور ان کے مفادات باہم متصادم ہو سکتے ہیں۔ایسے میں اپنے اپنے گروہ کے باعث طاقت ور ہو جانے والے، کمزور کو دبانے اور اپنا الو سیدھا کرتے جانے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ بالفاظِ دیگر'' ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ اگر غور کیا جائے تو یہی جنگل کا قانون ہے۔

جنگل کے قانون کا راج

جنگل میں ہمیشہ طاقت ہی راج کرتی ہے۔یہی بہیمیت ہے۔اور زمانہ قبل از اسلام میں اسی بہیمیت کا راج قائم تھا۔کیونکہ اِس میں طاقتور کی من مانی خواہشوں ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اِس لیے یہ انسانی معاشرہ کے لیے بہیمانہ نظامِ حیات ہے اور انسانی معاشرہ کے لیے کسی بھی طرح سے موزوں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس میں کمزور کو جینے کا حق بھی نصیب نہیں ہوتا۔لہٰذا جنگل میں اگر حیوانیت راج ہے تو لازم ہے کہ انسانی معاشرہ میں بھی انسانیت ہی راج کرے۔ اِس تناظر میں عرب ذہن کو مزید کھوجا اور کھنگالا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از بعثت میں وہاں عین جنگل کا راج ہی قانونی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا۔اور ضرورت تھی کہ انسانی عقل وشعور کو انسانیت کی اعلیٰ وارفع اقدار لوٹائی جائیں۔ اِس سے قبل عرب، طاقت وقوت اور ضعف وکمزوری کے درمیان فرق کے معاملے میں عرب دس افراد کے اجتماع کو طاقت کی بنیادی قابل قدر اکائی کے معنی میں لیتے تھے۔عدم تحفظ کے احساس سے بچنے کے لیے یہ تعداد ایک نصاب کا درجہ رکھتی ہے۔عرب ماحول ومعاشرے میں جو بنیادی طور پر قبائلیت کی بنیادوں پر تقسیم تھا، عدمِ تحفظ سمیت جملہ خطرات کے سامنے اپنا مزاحمتی وجود بنائے رکھنے کے لیے یہ تعداد ناگزیر سمجھی گئی ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہ زمانہ قبل از اسلام کا عرب ذہن ہے اور ہماری آج کی معاشرت میں بھی اگر یہی جنگل کا قانون ہی راج کرتا نظر آتا ہے تو اِس کی وجہ ہماری اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دوری ومہجوری کے سوا کچھ اَور نہیں ہے۔لہٰذا ہمارے یہاں پائی جانے والی نسلی، لسانی، سیاسی یا فرقہ وارانہ جتھہ بندیاں عین جاہلی نظامِ حیات ہی کی نمائندگی وترجمانی کرتے ہیں۔ یہ تصورات اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے۔ البتہ عربی زبان وادب کی ان نزاکتوں سے آگاہی کے بغیر ہم اِس قابل بھی نہیں ہو سکتے کہ قرآن حکیم اور اُسوۂ رسول کریم ﷺ کے تعبیری اسالیب کو پوری صحت کے ساتھ سمجھ سکیں۔ ان گم گشتہ باریکیوں کی بازیافت اس لیے بھی بے حد ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم ان معاشرتی وسماجی تبدیلیوں اور جملہ تغیرات کا کامل ادراک کر سکیں جو کہ عہدِ رسالت مآب علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیمات میں قرآنی تعلیمات کے تحت بروئے کار آئے

ہیں اور جن کو بجا طور پر رسول کریم ﷺ کے اسوہ عمرانی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اِس میں نہ صرف یہ کہ کمزوروں کو جینے کا پورا حق اور موقع دیا جاتا ہے بلکہ اسلامی نظامِ حیات کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ کمزوروں کی کمزوری کو دور کرتے ہوئے ان کو بھی ایک محفوظ و باعزت زندگی عطا کرے۔ اور سماجی ناہمواریوں سمیت ہر طرح کی ناانصافی کو بھی انسانی سماج سے دور کرے۔

جنگل، جہاں بس طاقت ہی راج کرتی ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ جو طاقتور وہی راجہ۔ حیوانات اور جانوروں کی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد یہی ہے۔ یہ سب ہم آج بھی اپنی معاشرت میں گندھا ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اللہ پاک نے آنکھیں، کان اور دل و دماغ ایسی عظیم نعمتیں عطا کر رکھی ہیں مگر ہم ان کا حق ادا کرنے کی طرف مائل و متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر ہم ذرا غور و خوض کی عادت اپنا لیں تو یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی کہ انسانی سماج میں یہ نظام کسی بھی طرح سے موزوں و مناسب یا اِس اشرف المخلوقات کے شایانِ شان نہیں ہے۔ جب ہم اپنے سماج میں ظلم و ناانصافی اور سماجی ناہمواریوں کے خاتمہ نیز عدلِ اجتماعی کے قیام کی بحیثیت مجموعی ضرورت محسوس کریں گے تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ انسانی سماج میں صالح اور فلاحی شعورِ اجتماع کا راج ہی اِس کے شایانِ شان ہے۔ اِس نکتے کو اسلام کے فلاحی اور تعمیری نظامِ معاشرت اور زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی معاشرت کا مابہ الامتیاز قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر دونوں کا حقیقی فرق بھی بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو قبائلیت اور کفو کے فروغ میں کوئی مضائقہ ہی نظر نہیں آتا نہیں اس نکتے پہ بطورِ خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ماحول اور معاشرے میں ذات پات اور قبائلیت کا فروغ اسلام کی اعلیٰ و ارفع اقدار کی کھلی نفی پر مبنی ہے۔ اِس سے اصولِ مساواتِ انسانی اور اصولِ عدلِ اجتماعی دونوں کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کی سخت سرزنش کی ہے جو آنکھیں کان اور عقل و خرد رکھتے ہوئے اور سمجھ بوجھ کی استعداد کے مالک ہوتے ہوئے بھی اِن عطیاتِ خداوندی سے پورے طور پر استفادہ نہیں کرتے۔ اور حیوانات کی مثل زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو حیوانات سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

’’وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لاَّ يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُوْلٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ‘‘ (الاعراف:179)

ترجمہ: ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہت سوں کو جہنم کے لیے پیدا کر دیا ہے، یہ دل و دماغ تو رکھتے ہیں مگر ان کے ذریعے سمجھ حاصل نہیں کرتے، اِن لوگوں کے پاس آنکھیں تو ہیں مگر اِن کی مدد سے حاصل ہونے والی بصارت اور بصیرت کا اِن میں فقدان ہے، اِن لوگوں کے پاس کان بھی ہیں مگر اِن سے سننے کا حق ادا نہیں کرتے، زندگی گزارنے کے عمل میں یہ چوپائیوں کی طرح ہیں، بلکہ گمراہی میں اُن سے بھی آگے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت کا شکار ہیں۔

اُسوہ عمرانی کے بنیادی تصرفات

عہدِ رسالت مآب علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیمات میں وحشیانہ نوعیت کے قبائلی نظامِ حیات کا باقاعدہ خاتمہ فرما کر جنگل کے قانون کی عملداری ختم کر دی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے لوگوں کی سب بڑی ضرورت بلکہ بہت بڑی مجبوری ’’عدمِ تحفظ‘‘ کے کربناک

احساس سے انہیں نجات دلانے کے لیے مدینہ منورہ کی حدود میں میثاقِ مدینہ کی بنیاد پر ایک ریاست قائم فرمائی ہے۔ اور عہدِ جاہلی کے نظامِ حیات کی جگہ رسولِ کریم ﷺ کی نگرانی میں ہی حسبِ ذیل تین بنیادی نکات پر مبنی تصرفات عمل میں لا کر عرب معاشرے کے بنیادیں ہی تبدیل فرما دی تھیں:

۱۔ مساواتِ انسانی

۲۔ عدلِ اجتماعی

۳۔ ریاستی عملداری

انہی تین بنیادوں پر مدینہ طیبہ کی اولین اور حقیقی معنوں میں ایک فلاحی و تعمیری اسلامی ریاست کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ ان تغیرات و تصرفات کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ اِس تصرف کے بعد اب ریاستِ اسلامی میں طاقت راج نہیں کرے گی بلکہ شعورِ اجتماع کا راج ہوگا اور شعورِ اجتماع کے اوپر قرآنِ حکیم اور اس کی عملی تفسیر و تعبیر کے طور پر رسولِ کریم ﷺ کا اسوۂ عمرانی براہِ راست راج کرے گا۔ یوں دنیا عدل و انصاف اور امن و سکون سے معمور ہوگی۔ جینے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع سب کو میسر ہوں گے۔ اور اگر کوئی کسی وجہ سے کمزور ہوگا یا ہو جائے گا تو ریاست اس کی دستگیری بھی کرے گی۔ یہی تین نکات عہدِ جاہلیت کے معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا مابہ الامتیاز ہیں۔ نظام کی یہی تبدیلی دراصل فتحِ مبین کہلائی ہے۔ اِسی تبدیلی کی بدولت ایک حیوانی زندگی سے باہر نکل کر لوگ اشرف المخلوقات کے عظیم مقام پر فائز ہوئے تھے۔ اور ان کے کردار و عمل کو اعلیٰ ترین انسانی و اسلامی اقدار سے ہم آہنگ کر دیا گیا تھا۔ فتحِ مکہ کے موقع پر حضور رسولِ کریم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اِس بات کا برملا اور واضح اعلان فرما دیا تھا۔ قریشِ مکہ کو مخاطب فرماتے ہوئے جو کلمات ارشاد فرمائے وہ صاحبِ سبل الہدیٰ والرشاد کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں:

''وَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ نَخْوَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَ تَکَبُّرَھَا بِاٰبَآئِھَا۔ کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ ثُمَّ تَلَا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ''۔(8)

ترجمہ: اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے جاہلیت والی نخوت اور اس کے تحت آبا وٴاجداد اور حسب و نسب کی بنیاد پر بڑے پن کو تم لوگوں سے دور کر دیا ہے۔ تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیۂ مبارکہ تلاوت فرمائی: ''یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ'' (الحجرات: 13) ترجمہ: اے لوگو! یقیناً ہم نے تم لوگوں کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم لوگوں کے عمرانی دھڑے اور قبیلے بنا دیے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، بلا شک و شبہ تم میں عزت و تکریم کا زیادہ حقدار وہ ہے جو معصیت سے زیادہ احتیاط و پرہیز کرنے والا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔

اور ابن سعد کی روایت کے مطابق فتحِ مکہ کے اگلے روز آپ ﷺ نے بصیغۂ امر ارشاد فرمایا تھا:

''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ الْغَدَ مِنْ یَوْمِ الْفَتْحِ: اَذْھِبُوْا عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَ فَخْرَھَا بِاٰبَآئِھَا۔ اَلنَّاسُ

کُلُّھُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ''۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے اگلے روز فرمایا: تم سب لوگ عہدِ جاہلیت کی طرز کے مصنوعی بڑے پن کو اور اس کے آباؤ اجداد اور حسب ونسب کی بنیاد پر فخر وغرور کو خود سے دور کر دو۔ تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے۔(9)

جار اللہ زمخشری اپنی معروف کتاب ''الفائق'' میں لفظ ''عُبِّیَۃ'' کا معنی: ''کبر'' بیان کرتے ہیں اور پھر وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اَلْمُتَکَبِّرُ یُوْصَفُ بِالتَّرَفُّعِ وَ التَّطَاوُلِ: ''، یعنی: متکبر کو اس کی مصنوعی اونچی شان اور بلند بانگ دعوؤں سے پہچانا جاتا ہے۔(10)

ہماری معاشرت آج بھی اگر قبائلی مزاج رکھتی ہے تو اِس کا بنیادی سبب یہی عدم تحفظ کا احساس ہے۔ لوگوں کو اپنوں کی آڑ میں ہی تحفظ ملتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگ قبائلی مزاج واثر سے باہر آ جائیں تو عدل اجتماعی کے قیام کے ذریعے ہماری ریاست کو انہیں یہ یقین دلانا ہوگا کہ ریاستی حدود میں قانون کی بالا دستی یقینی ہے اور یہ کہ تمام لوگوں کا سب کچھ ریاست کی چھتری کے نیچے پوری طرح سے محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کسی سبب کو دور کیے بغیر کوئی کچھ بھی کر لے اُس کے مسبَّب یا پیداوار کا خاتمہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔(11)

معاشرہ، انسانی ہجوم آبادی کو نہیں کہتے۔ محض انسانوں کا ہجوم ہوگا تو درندگی وسفاکیت، ایک دوسرے کی حق تلفی وناانصافی اور فتنہ وفساد میں ہی اضافہ ہوگا۔ لہٰذا ظلم وجور پر قابو پائے بغیر کسی بھی ہیئتِ اجتماعی کو معاشرہ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہیئتِ اجتماعی میں نظم و نسق، ضبط وانقیاد اور اعتدال وتوازن کے قیام سے ہی ایک باقاعدہ معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہاں دو طریقے سامنے آتے ہیں۔ ایک عربوں کا تصورِ معاشرہ ہے جس کے تحت کم سے کم دفاعی صلاحیت کا حامل ہو کر ظالم وجابر کے سامنے مزاحمتی دیوار کھڑی کرنے کے لائق ہو کر ہیئتِ اجتماعی میں شرکت۔ جبکہ دوسرا ہے مشترک زندگی میں لوگوں کے مابین ''عدل اجتماعی'' کا قیام۔

میثاقِ مدینہ کے تحت رسول کریم ﷺ نے عدل اجتماعی کی بنیاد رکھ کر لوگوں کی بقا وتحفظ اور اُن کے مابین نزاعات کو عدلِ اجتماعی کے تابع فرما دیا تھا۔ اِس تصرف کے تعلق سے ڈاکٹر حمید اللہؒ کی مرتب کردہ میثاقِ مدینہ کی دستاویز میں وارد کلمات ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

''و انه ما کان بین اهل هذه الصحیفة من حدث اَو اشتجار یُخاف فسادُه فان مردّه الی الله و الی محمد رسول الله ﷺ۔''(12)

ترجمہ: اور یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ اِس معاہدہ میں شامل افراد کے مابین کسی بھی طرح کا حادثہ رونما ہوا یا نزاع وانتشار کا معاملہ ہوا، جس کے باعث فتنہ وفساد کے پھیل جانے کے خطرات درپیش ہوں، تو اللہ کے عطا کردہ نظام، قرآن حکیم، کے سامنے اور اُس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں اُس امر کی ازسرنو پیشی یقینی ہوگی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عربوں کی معمول کی عدالتیں ہی حسبِ دستور اپنے فرائض کی انجام دہی پر مامور رہی ہیں۔ مگر اِس تصرف کے باعث فیصلہ سازوں کو یہ خوف دامن گیر ہوگیا تھا کہ ان کے ہاتھوں اگر ظلم وزیادتی پر مبنی کوئی بھی فیصلہ صادر ہوگیا تو معاملہ پہلے کی طرح یہیں ختم ہونے والا نہیں ہے۔ بلکہ بارگاہِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اُس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر ہوجائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ ساتھ ہی ظالم فیصلہ ساز کی عقل و دانش اور عزت و وقار کا بھی جنازہ نکل جائے گا۔ رسولِ کریم ﷺ کے اسوہ عمرانی کا طریق انقلاب یہ ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ جب پوری احتیاط برتنے لگ گیا تو معاشرے سے ظلم وزیادتی کا خاتمہ یقینی ہوگیا۔ مزید برآں اس تصرف کے باعث لوگ بھی اپنے بچاؤ اور تحفظ کے لیے اب اپنے اہل قبیلہ کی طرف دیکھنے کی بجائے بجا طور پر ریاست کی طرف دیکھنے لگ گئے تھے۔ یوں حالات کو ساز گار بنا کر ہی رسولِ کریم ﷺ نے عہدِ جاہلیت کے ساختہ و پرداختہ قبائلی نظامِ حیات کا مکمل خاتمہ کا اعلان فرمایا تھا۔ خطبہ فتح مکہ کا بنیادی موضوع ہی یہی امر ہے۔ عدلِ اجتماعی کے اصول پر ان امور کی انجام دہی اور جملہ مسائل و مشکلاتِ حیاتِ اجتماعی کے حل کی ذمہ داری ریاستِ مدینہ کے سر پہ عائد فرما دی گئی تھی۔ چونکہ آپ ﷺ خود اِس ریاست کے اولین والی تھے، اِس لیے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری خود اپنے سر لے لی تھی۔ جب تک ریاستِ مدینہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے قابل رہی ہے، قبائلیت کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ مگر جیسے ہی ریاست کمزور ہوئی اور لوگوں میں پھر عدمِ تحفظ کا احساس پیدا ہوا، ان کے پاس قبائلیت کی طرف دیکھنے اور مراجعت کے سوا کوئی اَور راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔

ان امور اور لوگوں کی فطری کمزوریوں اور حاجتوں کو بعد کے وقتوں میں اَور بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ان بنیادی ضرورتوں سے دھیان ہی ہٹ گیا تھا۔ قرآن حکیم نے حیاتِ اجتماعی کی مشکلات کا آسان حل دیا تھا۔ خود رسول کریم ﷺ نے اپنے اُسوۂ عمرانی کے تحت مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی کے بنیادی اصول عطا کرتے ہوئے، ایک پاکیزہ و شفاف انسانی سماج کی بنیادیں بھی مضبوط فرما دی تھیں۔ اور مثالی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل فرمائی تھی۔ یہی صراطِ مستقیم تھا جس سے انحراف نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ ہماری حیاتِ اجتماعی کی ساخت ہی کچھ سے کچھ ہوگئی ہے۔ اور کسی کو اندازہ تک نہیں ہے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے ہیں؟

اپنے بچاؤ کو یقینی بنانے کی قرآنی صلاح

صراطِ مستقیم سے غیر محسوس انحراف ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ آج بھی اس قوم میں جاری و ساری ہے۔ اس کے سامنے بندھ باندھنے کی کہیں کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔ اور مغربی جمہوریت کی مضبوطی سمیت جن کوششوں کی طرف کسی کی نظر جا سکتی ہے وہ بنیاد سے محروم ہیں اور یقیناً اپنے وقت پر بے سود ہی ثابت ہوں گی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نصاریٰ اگر پونے چھ سو سال میں اپنی اُصل سے بہت دور چلے گئے تھے تو لگ بھگ ڈیڑھ ہزار برس کی مسافت کے دوران ہماری اپنی اُصل سے دوریاں کس قدر بڑھ گئی ہوں گی۔ پوری ملت اسلامیہ آزمائش سے گزر رہی ہے۔ پاکستان کا معاملہ اَور بھی پیچیدہ ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ان دنوں مملکتِ خداداد

پاکستان پر اندرونی اور بیرونی دباؤ کی یورش ہو رہی ہے۔ یہ بھی قدرت کا ایک اُصول ہے جس کا مشاہدہ بھی عام ہے کہ جب کبھی کوئی چیز خاتمہ کے قریب آتی ہے تو اس کی کثرت اور زور میں کئی گنا اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔ مرض الموت کا سنبھالا بھی اسی نوع کی ایک چیز ہے۔ چراغِ حیات کی لَو بجھنے سے کچھ دیر قبل بھڑک اٹھتی ہے اور پھر ہمیشہ کی خاموشی طاری ہو جایا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ امید رکھنی چاہیے کہ یہ تخریبی ملبہ آنے والے دنوں میں تعمیر کے عمل میں صرف ہوگا۔ معاشی ابتری، معاشرتی بد نظمی اور اخلاقی پستی نے دشمنوں کے لیے ہمارے یہاں کے سارے اہداف آسان بنا دیئے ہیں۔ پوری قوم مذہبی بنیادوں پر لخت لخت ہے اور بدخواہوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ وطن عزیز پر چاروں اطراف سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اس طرح کے دباؤ کے مقابل شخصی و قومی سالمیّت کے بچاؤ اور وقار کے تحفظ کے لیے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل بنیادی ضابطہ عطا فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (ال عمران:103)

ترجمہ : اور تم سب لوگ اللہ کی رسی (اللہ کی طرف سے حیاتِ شخصی و اجتماعی کے عطا کردہ خطوط پر استقامت کے ساتھ قیام) کے ذریعے عدمِ تحفظ کے ہر دباؤ و خوف سے اپنا بچاؤ و تحفظ یقینی بناؤ اور گروہوں و فرقوں میں تقسیم مت ہونا اور یاد کرتے رہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کہ جن برے وقتوں میں تم سب آپس میں ایک دوسرے کے کھلے دشمن بن چکے تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں تالیف پیدا کر دی تو تم اس کی نعمت کے طفیل بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے تک آ گئے تھے پھر اُس نے تمہیں اِس سے بچا لیا، اللہ اپنی نشانیاں اسی طرح ظاہر کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پکڑو۔

آیتِ مندرجہ بالا کے کلمات، ان کی ترکیب و بندش اور اس کا نفس مضمون آپ سے آپ بتا رہا ہے کہ اس حکم کا تعلق مسلمانوں کی جانوں اور املاک کے لیے کسی دباؤ کی طرف سے پیدا کردہ عدمِ تحفظ کے احساس کا مقابلہ کرنے سے ہے۔ مگر متقدم مفسرین نے جو راستہ دکھایا پوری قوم اس پر بے سوچے سمجھے چل پڑی ہے اور آج تک انہی راہوں پہ چلتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اِس تعبیر و تشریح کے باعث اُصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئی۔ ''یَعْتَصِم'' کی تفسیر کرتے ہوئے زمخشری لکھتے ہیں:

(وَمَنْ يَعْتَصِمْ) وَمَنْ يَتَمَسَّكْ بِدِيْنِهٖ وَيَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ حَثًّا لَهُمْ عَلَى الْاِلْتِجَآءِ اِلَيْهِ فِي دَفْعِ شُرُوْرِ الْكُفَّارِ وَمَكَايِدِهِمْ(13)

ترجمہ : ''وَمَنْ يَعْتَصِمْ'' (مطلب یہ کہ) جو کوئی اللہ کے دین سے وابستہ و منسلک ہو جائے گا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اس آیہ میں اس کلمہ کے ذریعے کفار کے شرور اور مکر و فریب سے دفاع کی خاطر اللہ کی پناہ لینے پر اکسایا جا رہا ہو۔

مقصودِ اُصلی تو عدمِ تحفظ سے بچاؤ کی تدبیر کرنا تھا۔ اس طرف تو دھیان ہی نہیں ہے۔ البتہ بطورِ امکان سہی مگر اتنا ضرور تسلیم کر لیا گیا ہے کہ کفار کے مکر و فریب اور شر و فساد سے بچنے کی راہ دین سے وابستگی ہی ہے۔ اِس کو نص قرآنی میں وارد صریح کلمات کی درست تعبیر تسلیم کرنے میں تامل کی کافی گنجائش ہے۔ اسی کی پیروی میں رازی لکھتے ہیں :

(وَمَنْ يَّعْتَصِمْ)   وَمَنْ يَّتَمَسَّكْ بِدِيْنِ اللهِ, وَيَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ حَثًّا لَّهُمْ عَلَى الْاِلْتِجَآءِ اِلَيْهِ فِيْ دَفْعِ شُرُوْرِ الْكُفَّارِ۔ وَالْاِعْتِصَامُ فِي اللُّغَةِ الْاِسْتِمْسَاكُ بِالشَّيْءِ وَاَصْلُهٗ مِنَ الْعِصْمَةِ, وَالْعِصْمَةُ الْمَنْعُ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ, وَالْعَاصِمُ: اَلْمَانِعُ, وَاعْتَصَمَ فُلَانٌ بِالشَّيْءِ اِذَا تَمَسَّكَ بِالشَّيْءِ فِيْ مَنْعِ نَفْسِهٖ مِنَ الْوُقُوْعِ فِيْ اٰفَةٍ۔(14)

ترجمہ :(وَمَن يعْتَصِم) کا معنی ہے: اور جو بھی اللہ کے دین کے ساتھ وابستہ ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا اکسایا جا رہا ہو کہ ذاتِ خداوندی کی پناہ میں آجائیں کفار کے شر سے دفاع کی خاطر۔ اور اعتصام کا لغت میں معنی ہے: ''اَلْاِسْتِمْسَاکُ'' یعنی: کسی بھی شے سے وابستگی اور چپک کر رہ جانا۔ اور اس کلمہ ''یُعْتَصِم'' کی اَصل عصمت ہے۔ اور عصمت عربی میں روکنے کو کہتے ہیں۔ اور عاصم روکنے والے کو کہتے ہیں۔ اور ''وَاعْتَصَمَ فُلَانٌ بِالشَّيْءِ'' تب کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی آفت میں پڑنے سے اپنے آپ کو روکنے کے لیے کسی شے سے چپک کر رہ جائے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سے راستہ تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ بات تب کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی شے کا سہارا لے کر خود کو بچا لے۔ مثال کے طور کسی تند و تیز سیلابی ریلے میں بہہ جانے سے بچنے کے لیے اسے کسی درخت کی جڑ ہاتھ آ گئی تو وہ اُس سے چپک کر رہ گیا اور یوں اُس نے خود کو بچا لیا تو عصم کا معنی چپکنا کیسے ہو گیا؟ بچاؤ کرنا کیوں نہیں رہا؟

عصمت عربی میں روکنے کو نہیں بچاؤ اور حفاظت کو ہی کہتے ہیں۔ روکنے کے اندر ابہام ہے۔ شر و فساد اور ضرر وزیاں کو روکنا تو اپنا بچاؤ کرنا ہی ہے۔ تو صراحت لفظی سے انحراف کرتے ہوئے ابہام کا پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''وَمَن يَعْتَصِم'' کا معنی سمجھانے میں اتنا زور صرف کرنا پڑ رہا ہے۔ عصمت کے عین کنارے تک آنے کے بعد ایک غیر معتبر محاورے کا سہارا لے کر اعتصام کو تمسک کے ہم معنی قرار دے دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تمسک خود بھی تو عربی کلمہ ہے۔ قرآن حکیم نے یہاں اس کا انتخاب و استعمال کیوں نہ کیا؟ فقط ''وَالْعَاصِمُ'' بمعنی: ''اَلْمَانِعُ'' کو ہی دیکھ لیجیے۔ ''منع کرنے والا'' کی بجائے ''بچانے والا'' کے معنی میں یہ کلمہ قرآن حکیم متعدد مقامات پہ وارد ہوا ہے۔(15)

ابن منظور افریقی عصم کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اَلْعِصْمَةُ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ اَلْمَنْعُ۔ وَعِصْمَةُ اللهِ عَبْدَهٗ: اَنْ يَّعْصِمَهٗ مِمَّا يُوْبِقُهٗ۔ عَصَمَهٗ يَعْصِمُهٗ عَصْمًا: مَنَعَهٗ وَوَقَاهُ''(16)

ترجمہ: ''اَلْعِصْمَةُ'' عربی میں روکنے کو کہتے ہیں۔ اور ''عِصْمَةُ اللهِ عَبْدَهٗ'' سے مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ہر اُس شے سے بچائے جو اُس کی ہلاکت و بربادی کا سبب بن سکتی ہو۔ یہ فعل متعدی ہے اور باب ضرب سے آتا ہے۔ مصدر ''عَصْمًا'' اور معنی ہے: اُس کو روکا اور اُس کو بچایا۔

ابن منظور افریقی نے بھی اِس کلمہ کے حقیقی معنی کو دوسرے درجے میں ہی رکھا ہے۔ اور تعجب کی بات ہے کہ خود اِس بلند پایہ لغت نویس کو بھی اپنی بات پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ ورنہ ''اَنْ يَّعْصِمَهٗ مِمَّا يُوْبِقُهٗ'' کی بجائے ''اَنْ يَّمْنَعَهٗ مِمَّا يُوْبِقُهٗ'' کہنا چاہیے تھا۔

اور اگر آپ کا اپنی ''اَلْمَنَعُ'' والی اسی بات پہ اصرار ہی ہے تو بھی لازم ہو جاتا ہے کہ ''اَلْمَنَعُ عَنْہُ'' کہیں۔ تاکہ یہ کلمہ اپنے صلہ سے مل کر دوسرے انداز سے ''بچاؤ'' و ''تحفظ'' کا معنی دینے کے قابل ہی ہو جاتا۔

اب قرآنِ حکیم کے ان مقامات پہ غور کرنے سے اس تغیر معنوی کی حقیقت کا اندازہ بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ متذکرہ بالا تعبیر نا قابل فہم ہی نہیں بعید از قیاس بھی ہے۔ اور متقدمین نے اس لفظ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ حقیقت سے دور اور سمجھ سے بالا ہے۔ اب ہمارے مترجمین کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے تو یہ دونوں ہستیاں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ اَور بات ہے کہ علامہ اقبال مطمئن نہیں ہیں اور کہتے ہیں:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف(17)

اس تصرف اور تبدیلی سے کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے نتیجے میں یہ اہم ترین ضابطہ ہماری حیاتِ اجتماعی اور اس کے مقاصدِ عالیہ سے دور اور غیر مربوط ہو گیا ہے۔ بلکہ ایک بزرگانہ نصیحت اور واعظانہ تلقین بن کر پوری طرح سے غیر مؤثر ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنی عملی حیات سے یوں قرآن حکیم کے حیات بخش ضابطے ایک ایک کر کے بے دخل ہوتے چلے گئے ہیں۔ یہ غلط فہمی جو ''اِعْتَصِمُوا'' کے بارے میں پیدا ہوئی ہے اس کو قارئین کرام خود دیکھ چکے ہیں کہ کافی پرانی ہے اور ہمارے قومی اندازِ فکر و نظر میں اپنی جڑیں جما چکی ہے۔ اردو تراجم میں بھی اس کی فقط پیروی ہی پائی جاتی ہے۔ اس کلمے سے شروع ہونے والے پورے فقرے ''وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا'' کے تعلق سے چند معروف و متداول تراجمِ قرآنی پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ شاہ ولی اللہ نے ''و چنگ زنید بہ رسن خدا جمع آمدہ و پراگندہ مشوید'' (18) لکھا ہے۔ ''چنگ زنید'' کا مطلب ہے پنجہ مارو یا ہاتھ جماؤ۔ برصغیر میں اور بالخصوص اردو تراجمِ قرآنی کی دنیا میں زیادہ تر شاہ ولی اللہ ہی کی پیروی نظر آتی ہے۔ آپ ہی کی اتباع کرتے ہوئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو'' (19)۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ لفظِ ''اِعْتَصِمُوا'' کے معنی و مفہوم پر غور کیے بغیر محض متقدمین اور شاہ ولی اللہ کی پیروی میں ان کے ترجمہ کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ قوم اور اس کے افراد، ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کو یقینی بنانے اور عدمِ تحفظ کے خوف سے نکالنے والا یہ اہم ترین ضابطہ ہرگز غیر مؤثر ہو کر ایک واعظانہ نصیحت نہ بنتا اگر آنکھیں بند کر کے پیروی کی بجائے کچھ غور بھی کر لیا جاتا۔ اب چونکہ ایک راستہ بن گیا ہے اور اس پر چلنا بھی آسان ہو گیا ہے اس لیے سب پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس فقرے کے چند دیگر تراجمِ قرآنی بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ فتح محمد جالندھری نے: ''اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا''، احمد رضا خاں بریلوی نے: ''اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا (فرقوں میں نہ بٹ جانا)''، پیر محمد کرم شاہ الازہری نے: ''اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا''، امین احسن اصلاحی نے: ''اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو''۔ مزید برآں الفاظ کی تحقیق کے زیرِ عنوان مزید لکھتے ہیں: "اعتصام کے معنی کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے ہیں"، ابوالاعلیٰ مودودی نے: ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو''، محمد جوناگڑھی نے: ''اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو''، کا ہی ترجمہ اختیار کیا ہے (20)۔

فقط تراجم پر انحصار کرنے اور انہی کی مدد سے قرآن فہمی کے حصول کی کوشش کرنے والوں کے لیے ان افاضل اور اکابر کے متفق علیہ تراجم سے ہٹنا یقیناً بہت مشکل اور دشوار ہوگا۔ اس طرح اس حجاب کے باعث حقیقت تک رسائی کسی طرح ممکن نہیں رہے گی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ اتفاق رائے ایک غلط ترجمہ پر ہے۔ کاش کہیں کسی صحیح بات پر بھی ہوتا۔ یہ بھی دھیان رہے کہ مشہور و متداول اردو تراجم، قرآن حکیم کے ہم پلہ کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ یہ انسانی فہم ہے جس میں کوتاہی ممکن ہے۔ مگر ایسا کسی ایک آدھ جگہ ہوتا تو بھی غنیمت جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تراجم قرآنی اس طرح کی ''متفق علیہ'' اغلاط سے معمور ہیں۔

یہ تمام تر تراجم ''اِعۡتَصِمُوا'' کا ترجمہ کسی طرح نہیں کہے جا سکتے۔ ان مترجمین نے جو ترجمہ اختیار کیا ہے اس کے لیے خود قرآن حکیم نے عربی کلمہ: ''اَخَذَ یَاۡخُذُ اَخۡذًا'' بمعنی: لینا، پکڑنا (21)، اختیار کیا ہے۔ یہ بھی غور کیجیے کہ یہ کلمہ مجرد کے باب سے ہے۔ اور اس کے اندر مضبوطی سے پکڑنے والی ابھی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ فقط '' پکڑنا'' کا ہی معنی دے سکتا ہے اور دے گا۔ اس لیے جہاں جہاں قرآن حکیم کو قوت و مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت دینا مقصود تھی وہاں لفظاً وضاحت کر دی جاتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ مثالوں سے معلوم ہوگا۔ اس سے فعل اَمر بنے گا تو واحد کے لیے کلمہ ہوگا: ''خُذ''، اور جمع کے لیے: ''خُذُوۡا''۔ واحد کی مثال ہے: یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (مریم:12) یعنی: ''اے یحیٰ! کتاب کو پوری قوت و مضبوطی سے پکڑ لو''۔ اور جمع کی مثال ہے: ''خُذُوۡا مَا اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ'' (البقرہ:63) یعنی: ''جو کچھ بھی ہم نے دیا ہے اسے پوری قوت و مضبوطی سے پکڑ لو''۔ دونوں مقامات پر لفظ قوت، مضبوطی کی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ اگر اس لفظ کے اندر مضبوطی و استحکام اور پائیداری کے معنی کو شامل کرنا مقصود ہوگا تو عربی کے دستور کے مطابق اس کلمہ کو باب افتعال میں لے جایا جائے گا۔ باب افتعال میں آ کر اس کی صورت یہ ہوگی: ''اِتَّخَذَ یَتَّخِذُ اِتِّخَاذًا'' اس کا معنی ہے: ''مضبوط پکڑ بنانا'' مگر ہمارے اہل لغت نے بھی باب افتعال کی خاصیت کا پورا لحاظ نہیں رکھا اور جو معنی کیا ہے اس کے اندر کسی حد تک اس کی رمق ہی ملتی ہے۔ بلیاوی نے معنی کیا ہے: ''کر دینا، بنا دینا'' (22)۔ صاحبِ القاموس الوحید نے بھی یہی معنی کیا ہے (23) جو کہ پوری طرح صائب نہیں ہے۔ دونوں لغت نویسوں کے ہاں تکمیل فعل کا جو عندیہ ملتا ہے اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ یہ مضبوطی اور استحکام کا بدل ہوگا۔ کیونکہ اس سے صرفِ نظر اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کلمے کی قرآن حکیم میں مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ فعلِ اَمر میں واحد کے لیے:

''رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَاتَّخِذۡہُ وَکِیۡلًا'' (المزمل:9)،

ترجمہ: ''وہی رب ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی، اس کے سوا تمامی معبود باطل ہیں، تم پوری قوت و مضبوطی سے اسی کو اپنا کارساز بنا لو''۔

جبکہ جمع کی مثال ہے:

''اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا'' (الفاطر:6)،

ترجمہ: ''یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم سب بھی اس کو اپنا پکا دشمن ہی جانو''۔

اور اگر تمسک اور وابستگی کا معاملہ ہے تو اس کے لیے قرآن حکیم کا انتخاب تمسک اور اس کے مشتقات ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

''فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا'' (البقرہ:256)

ترجمہ: ''تو یقینی طور پر اس نے ایک ایسے مضبوط حلقہ سے وابستگی وتمسک کی سعی وچاہت کی ہے جس کی شکستگی کا تصور بھی باطل ہے''۔

اب ''اِعْتَصِمُوا'' کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اُصل ہے: ''عَصَمَ، یَعْصِمُ، عَصْمًا، عِصْمَۃً'' بمعنی: محفوظ رکھنا، بچانا، بچاؤ(24)۔ کیرانوی کہتے ہیں: ''فتنہ یا خطا سے بچانا، محفوظ رکھنا'' (25) ۔ بچانا، محفوظ رکھنا، بچاؤ اس لفظ کا حقیقی معنی ہے۔ اب اُصول یہ ہے کہ یہ کلمہ جب بابِ افتعال میں جائے گا تو اس معنی کے ساتھ بابِ افتعال کی خاصیت جمع ہوجائے گی۔ ابھی اوپر بتایا جا چکا ہے کہ بابِ افتعال میں جانے سے اس کلمہ کے اندر مضبوطی، ثبوت، دوام اور استقرار کا معنی اضافی طور سے شامل ہو جائے گا۔ اب یہ ایک عام روایت ومعمول کا کوئی کچا کام نہیں رہ جائے گا۔ بلکہ اضافی اور پوری توانائی کا طلبگار ہوگا۔ مگر بابِ افتعال میں آکر اس لفظ کا اُصل معنی ہی غائب ہوجائے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس تصریح کی روشنی میں لازماً بابِ افتعال میں جانے سے اس کلمہ کا معنی ہوجائے گا: ''جان، مال عزت وآبرو جس شے کو بھی عدمِ تحفظ کا سامنا ہو اس کو پوری قوت ومضبوطی سے بچانا اور محفوظ رکھنا''۔ پوری قوت اور مضبوطی سے پکڑنا اور تھامنا کسی طرح سے اس کا معنی نہیں ہوسکتا۔ مگر لغت نویس بھی متذکرہ بالا ہموار راستے پر ہی چلتے نظر آتے ہیں۔ کیرانوی کہتے ہیں: ''اللہ کے دین پر مضبوطی سے جمنا'' (26)۔ بلیاوی کہتے ہیں: ''ہاتھ سے پکڑنا'' (27)۔ اردو زبان میں بھی عربی سے ماخوذ بکثرت کلمات رائج ہیں جو بابِ افتعال سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً انتخاب، اقتدار، اجتہاد، اختلاف، اتفاق، ارتحال، انتقال، احتساب، اشتعال، اقتباس، اعتماد، ارتکاب، انتظام، احترام، امتحان وغیرہ۔ ان تمام میں یہ خاصیت ہمہ وقت ہر کس وناکس کو ملحوظ ہے۔ مگر جو نار وا تصرف ''اِعْتَصِمُوا'' کے معنی میں دیکھنے کو ملا ہے ایسی کسی تبدیلی کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔

قرآن حکیم میں یہ کلمہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مجرد میں اس کا استعمال اور معنی ملاحظہ کیجیے:

''وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ'' (المائدہ:67)۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے اور محفوظ رکھے گا''۔

اسی طرح:

''قُلْ مَنْ ذَا الَّذِی یَعْصِمُکُمْ مِنَ اللّٰہِ'' (الاحزاب:17)،

ترجمہ: ''آپ کہیے: کون ہے وہ جو تم لوگوں کو اللہ کی پکڑ سے بچائے گا''۔

اسی طرح سے ہے:

''قَالَ سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ'' (ھود:43)

ترجمہ: ''ابن نوح نے کہا: میں عنقریب پہاڑ کی پناہ لے لوں گا وہ مجھے بچالے گا پانی سے''۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں تمام مثالوں میں بچاؤ اور تحفظ ہی مراد ہے۔ یہ امثلہ تو مجرد کی تھیں۔اب مزید فیہ میں باب افتعال کی مثالوں پر بھی غور کیجیے۔ارشادِ باری ہے:

''وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ''(اٰلِ عمران:101)

ترجمہ: ''اورتم کفر کرتے کس برتے پر ہو حالانکہ تم لوگوں پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اورتم لوگوں کے بیچ اس کا رسول بھی موجود ہے،اور جوکوئی بھی اللہ کی مدد سے اپنے بچاؤ کو یقینی بنانے کی سعی کرے گا تو سمجھ لیجیے کہ اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت مل گئی ہے''۔

اوراسی قبیل سے ہے آیتِ زیرِ بحث میں واردکلمہ ''اِعْتَصِمُوا''۔اس کی دلیل سورۂ حج کی آخری آیتِ مبارکہ کے یہ آخری کلمات بھی ہیں:

''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ''(الحج:78)

ترجمہ :اوراپنا بچاؤ و تحفظ یقینی بناؤ اللہ کی مدد سے وہی تمہارا اولی و وارث ہے تو کتنا اچھا ولی و وارث ہے اور کتنا اچھا مددگار ہے۔

قرآن حکیم کے تراجم میں سے،کوشش بسیار کے باوجود،کوئی ایسا ہنوز نظر سے نہیں گزرا ہے جو اس غلطی پر لوگوں کو متوجہ اور متنبہ کرتا۔اگر ہم یوں ہی لکیر کے فقیر بنے رہے تو حقائق تک رسائی تو بہت مشکل ہے البتہ تاویلات کے نت نئے انبار لگا کر حجابات میں اضافہ ضرور کرتے رہیں گے۔اہلِ فکر و دانش اس سے یہ اندازہ بھی کرسکتے ہیں کہ کسی ایک تسامح یا غلطی پر متوجہ کرنے کے لیے اگر اس طرح کی طویل ابحاث اور گواہیوں اور دلیلوں کی حاجت ہوگی تو ہماری اپنی اُصل یعنی قرآن حکیم کی طرف ایک بامعنی مراجعت کا عمل کس قدر دشوار اور مشکل کام ثابت ہوگا؟اور فی زمانہ اُصل کام، تنقیح البرہان ہی ہے۔یعنی دینِ حق کی خدمت کرنے کا جذبہ ہو تو کرنے کا اُصل کام یہی ہے کہ قرآنی حقائق کو از سرِ نو مبرہن کردیا جائے۔کیونکہ ان حجابات کے ازالے کے بغیر صراطِ مستقیم کے خطوط کسی بھی طرح سے واضح ہونے کے نہیں ہیں۔

جب اہم ترین مآخذ و مراجع میں اس نوع کی تعبیری اغلاط کی بھرمار ہو اور افکار کی جہتیں ادھر سے اُدھر ہوچکی ہوں تو قوم کی تباہی اور بربادی یقینی ہوجاتی ہے۔نسلِ نو کے حق میں دُعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل خاص کے طفیل نئی نسل پر تحقیق وتفتیش اور رشد و ہدایت کے در کھول دے۔اور حقائق تک رسائی پیدا کرنے کی ان کو ہمت عطا فرمائے۔بہر طور یہ تمام اُمور پیش نظر تھے جن کے باعث سورۂ آل عمران کی آیت:103 کے ذیل میں راقم کا مختار ترجمہ جملہ مروج و متداول تراجم قرآنی سے مختلف ہے۔

سورہ الِ عمران کی آیت:103،عدم تحفظ پیدا کرنے والے کسی بھی دباؤ کا سامنا و مقابلہ کرنے کے تعلق سے بہت اہم ہدایت ایزدی ہے اور مسلمان قوم کے لیے ایک بنیادی عملی ضابطہ ہے۔اور فی زمانہ جب ہمارے اوپر تمام اطراف سے دباؤ کی یورش ہو رہی ہے تو اس ضابطے کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنا اور بھی زیادہ ضروری اور لازم ہوگیا ہے۔اس ضابطے میں صراحت موجود ہے

کہ ایک عالمگیر اور ہمہ جہت عدمِ تحفظ سے یہ بچاؤ تبھی ممکن ہوگا جب ہم فرقہ پرستی اور علاقائی، لسانی اور قبائلی وگروہی وابستگیوں سے بالاتر ہوکر اور ان کے بنیادی اسباب ومحرکات مثلاً حرص وہوس کو چھوڑ کر اللہ کے دین اور اُسوہ رسولِ کریم ﷺ کے تحت اپنی قومی وحدت وجمعیت کی تشکیلِ نو کریں گے۔ اور اخلاص وللّٰہیت سے سرشار ہوکر اُصولِ مساوات کی بالادستی اور عدلِ اجتماعی کے قیام کو یقینی بنائیں گے۔ تب تک دینداری اور تقویٰ وپرہیزگاری کے نام پر ہماری ہر کوشش ایک سعیٔ لاحاصل ہی رہے گی۔ بقول علامہ اقبالؒ

بہ مصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست   گر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

کیونکہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر اس اختلاف وافتراق کی وجوہات میں سے ''بَغۡيًا بَيۡنَهُمۡ'' (28) یعنی: آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی، کرنا سرکشی اور دوسروں پر اپنی بالادستی کے قیام کی منہ زور خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا''، کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ضابطہ بنا دیا گیا ہے:

''يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡيُكُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ مَّتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا''، (یونس:23)

ترجمہ: ''اے لوگو! تمہاری یہ سرکشی اور ایک دوسرے پر بالادستی کے قیام کی خواہش خود تمہاری اپنی جانوں کے اوپر وبال ہے، بس دنیا داری کا ساماں ہے''

اس وبال کو خود اپنے اوپر مسلط کر چکنے کے بعد ہماری نظروں کے آگے اُصل راہوں پر حجابات حائل ہیں۔ راہِ عافیت سجھائی دے تو آخر کیسے؟ مذہبی پیشوائیت نے دین، جو اُصولوں کا مجموعہ تھا اور شعورِ انسانیت کی بنیاد پر حیاتِ اجتماعی کو منظم کرنے کا ذریعہ تھا، کو جذبات کی راجدھانی بنا کر رکھ دیا ہے۔ جذباتِ انسانی وخوہشاتِ نفسانی اور دینی اقدار میں کھلی کھلی منافات ہے۔ اور فروعات میں اُلجھ کر اس قوم نے خود کو تباہی کی راہ پر ڈال رکھا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ فروعات بھی کچھ ایسی ہی ہیں کہ اگر بیچ سے شخصیت پرستی اور جذباتی وابستگی کو ہٹا دیا جائے تو ان کی کوئی دینی، شرعی اور اخلاقی حیثیت اور وقعت نہیں رہ جاتی۔ لوگوں میں حق اور حقیقت شناسی کے شعور کو فروغ دے کر ہی ہم خود اپنی اور آئندہ نسلوں کی زندگی کو ہر طرح کی زمینی وآسمانی آفات وبلیّات سے بچانے اور محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہ بہت مناسب وقت ہے کہ جملہ اختلافات وتنازعات پر مٹی ڈال کر اور دین وشریعت کے اُصول وکلیات کی بنیاد پر تمام گروہوں کو یکجا کرنے میں کامیابی کے حصول کے لیے ٹھوس اور عملی اقدامات کیے جائیں۔ ان حالات میں بھی جو لوگ اپنے اپنے گروہ یا فرقہ کی مضبوطی کے لیے کام کر رہے ہیں ان کو بالخصوص ان باتوں پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ یہ ضرورت تو کل بھی تھی مگر آج شدید تر ہے۔ اور یہ کام، قیامِ پاکستان کی طرح، اب اس قوم کے درد دِل رکھنے والے اہلِ فکر ودانش کے ہاتھوں ہی ممکن ہوسکے گا۔ مذہبی پیشوائیت شائد اس قابل بھی نہیں رہی ہے۔ البتہ اہلِ فکر ودانش کو ان امور پر ضرور غور وخوض کرنا اور قومی سالمیّت، سلامتی اور وقار کے تحفظ کے لیے میدانِ عمل کا رخ کرنا ہوگا۔ عدمِ تحفظ کا احساس قوموں اور ان کے افراد کو بے موت مار دیتا ہے۔ ضروری ہے کہ اہلِ دانش قرآن حکیم کے مضامین کی حقیقت جاننے کے لیے گہرے غور وخوض سے کام لیں اور ملک وملت کو ہر قسم کے دباؤ سے بچاؤ کا احساس پیدا کرنے کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کریں۔

اس میں شک نہیں کہ وطن عزیز میں دہشت گردی کے خلاف ہونے والے حالیہ آپریشنز کی کامیابیوں نے لوگوں کے اندر عدمِ تحفظ کے خوف کو خاصی بڑی حد تک کم کیا ہے۔مگر کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ کام قرآنی ہدایات وتعلیمات اور تصورِ جہادِ اسلامی کی روح کے عین مطابق ہے۔ضرورت ہے کہ مناسب قانون سازی کے ذریعے ان کارہائے نمایاں کو ایسا تحفظ مہیا کیا جائے کہ کوئی آنے والا عاقبت نااندیش اِس سارے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر سکے۔ بلکہ اسی توجہ، دھیان اور جانفشانی کے ساتھ ملک وقوم کے کار پرداز اِس عمل کو جاری وساری رکھنے کے پابند رہیں تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ بنایا جاسکے۔اور پورے اطمینان اور شرحِ صدر کے ساتھ یہ سب اُس وقت ممکن ہوسکے جب ہم دین اسلام کی اُن بنیادی اقدار سے واقف ہوں گے جن کے اوپر رسول کریم ﷺ نے مسلم معاشرت کی بنیاد رکھی تھی۔اور یہ بھی جان لیں گے کہ زمانہ ٔ قبل از اسلام کی معاشرت کس اصولی بنیاد پر استوار کی گئی تھی؟ اس امر کی وضاحت ''معاشرہ کی وجہ تسمیہ'' کے تحت ہوگئی ہے۔ جبکہ ایک بامعنی وفلاحی معاشرت کے قیام کی ناگزیریت نیز انسانی جان ومال کا عدمِ تحفظ اور بچاؤ کے تعلق سے قرآنی تجویز اور صلاح بھی واضح اور مبرہن ہوکر سامنے آگئی ہے۔ انہی بنیادوں پہ ہم جاہلی معاشرت اور اسلامی معاشرت کے اصل مابہ الامتیاز یعنی حقیقی معنوں میں ''سماجی مساوات، عدلِ اجتماعی اور ریاستی عملداری (Writt of the State)'' کے قیام کی ضرورت واہمیت اور افادیت کا پوری طرح سے احساس وادراک کرسکیں گے اور عملی جدوجہد کے لیے کمربستہ ہونے کے لائق ہوں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

مراجع وحواشی

1۔ الجوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح، تاج اللغۃ و صحاح العربیہ، دار العلم للملایین، 1956ء، ص: 747، ج: 2، مادّہ: عشر

2۔ الصاحب، عباد بن اسماعیل، الکفی الکفاۃ، المحیط فی اللغہ، بیروت، علم الکتاب، 1994ء، ص: 280، ج: 1، مادّۃ: عشر۔

3۔ ابن منظور افریقی، محمد بن مکرم، لسان العرب، مصر، مطبعۃ الکبریٰ المیر یہ، 1300ھ، ص: 246، ج: 6، مادّہ: عشر۔

4۔ ابن سیدہ، علی بن اسماعیل، ابی الحسن، المحکم والمحیط الاعظم، بیروت، دار الکتب العلمیہ طبع اول: 2000ء، ص: 358، ج: 1، مادّہ: عشر۔

5۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ علی ہامش الروض الانف، ملتان، عبدالتواب اکیڈمی، بلاسن طباعت ص: 103، ج: 1

6۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، محولہ بالا، ص: 97 تا 99، ج: 1

7۔ ابوتمام حبیب بن اُوس، الطائی، دیوان الحماسہ، کراچی، میر محمد کتب خانہ، بلاسن طباعت، ص: 21

8۔ الصالحی، محمد بن یوسف، الشامی، سبل الھدیٰ و الرَّشاد فی سیرۃ خیر العباد، القاہرہ: احیاء التراث الاسلامی، 1992ء، ص: 364، ج: 5

9۔ ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع الزہری، کتاب الطبقات الکبیر، قاہرہ، مکتبہ خانجی، طبع اول: 2001ء، ص: 132، ج: 2

10۔ الزمخشری، محمود بن عمر، جاراللہ، الفائق فی غریب الحدیث، بیروت، دارالفکر، 1993ء، ص: 384، ج: 2،

11۔ رسول کریم ﷺ کے اُسوۂ عمرانی کے تحت قبائلی نظام کے خاتمہ اور فلاحی معاشرتی نظام کے قیام کے تعلق سے تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم السطور کا تحقیقی مقالہ بعنوان: خطبۂ فتح مکہ اور ہماری حیات اجتماعی کا انحراف، مطبوعہ: مجلۂ معارفِ اسلامیہ، جامعہ کراچی، شمارہ: 14، 2013ء۔ نیز: ''ملت کی عمرانی اساس اور دوقومی نظریہ سے ہمارا اجتماعی انحراف''، مطبوعہ: مجلۂ معارفِ اسلامیہ، جامعہ کراچی، شمارہ: 15۔

12۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی ﷺ و الخلافۃ الراشدہ ؓ، بیروت، دار النفائس، 1987ء، ص: 62

13۔ زمخشری، محمود بن عمر، جاراللہ، الکشاف، بیروت، دارالکتاب العربی، بلاسن طباعت ص: 393 ج: 1

14۔ رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر، فخر الدین، التفسیر الکبیر، قاہرہ، مکتبہ عبدالرحمٰن محمد لنشر القرآن الکریم، بلاسنِ طباعت، ج: 4، ح: 8، ص: 170

15۔ ملاحظہ کیجیے: سورہ یونس: 27، ہود: 43، غافر (مؤمن): 33۔

16۔ ابن منظور افریقی، محمد بن مکرم، لسان العرب، بولاق مصر، المیریہ طبع اول: 1303ھ ص: 297، ج: 15

17۔ شاعرِ مشرق، محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال اردو، لاہور و کراچ، شیخ غلام علی، ششم، ستمبر 1984ء، ص: 370

18۔ محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، قرآن مجید مترجم ترجمۂ فارسی، (کوڈ 3-343)، لاہور، پاک کمپنی، بلاسن طباعت ص: 76

19۔ شاہ عبدالقادر، القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر مُوضح القرآن، کراچی، لاہور، ڈھاکہ، تاج کمپنی، بلاسن و کوڈ ص: 77

20۔ ملاحظہ کیجیے: متذکرہ بالا مترجمین کے تراجم قرآنی، بذیل آیت: 103، سورۂ آلِ عمران۔

21۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات، مادّہ: أخ ذ۔

22۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مادّہ: أخ ذ

23۔ کیرانوی، وحید الزماں، قاسمی، القاموس الوحید، مادّہ: أخ ذ

24۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مادّہ: ع ص م۔

25۔ کیرانوی، وحید الزماں، مادّہ: ع ص م

26۔ کیرانوی، وحید الزماں، مادّہ: ع ص م۔

27۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مادّہ: ع ص م

28۔ قرآن حکیم، سورۂ بقرہ کی آیت دوسو تیرا، سورۂ آلِ عمران کی آیت انیس، سورۂ شوریٰ کی آیت چودہ اور سورۂ جاثیہ کی آیت سترہ